کریم دشتی کی غزل میں بلوچی شاعری کا ایک نیا انداز

دولت خان*

ڈاکٹر گُل آور خان**

Abstract

This paper underline the salient features of a distinct poetic tradition of Balochi literature. This tradition of poetic homage to culture and land has in itself a mixture of ancient Balochi ballad and sufistic conception of devotion and love from Persian ghazal form. However, love and devotion in this particular poetic form is not directed towards divine or earthly beloved as such as in Persian ghazal, here characteristics of earthly and divine love are dedicated to one's land. It is different from Romantic love of nature in that romantic poet seeks scape or freedom into landscape and natural beauty which has a universal appeal. Whereas in this poetic tradition the poet eulogises the land of his own cultural heritage. It has its origin in old Balochi da'stan (poetic form of narrative and epic storytelling) and it also adopted certain characteristics of the Persian ghazal form. Se'yad Zahoor Hashmi and Ka'rim Dashthi have pioneering influence on this poetic genre in Balochi literature. In this paper concentrate is on Dashthi's poetry.

---

* دولت خان،(لیکچرار اِن انگلش لٹریچر) لسبیلہ یونیورسٹی اوتھل

** ڈاکٹر گل آور خان،(اسسٹنٹ پروفیسرایس ایس ایم اینڈ آئی ٹی) لسبیلہ یونیورسٹی اوتھل

تلخیص

اس مقالہ میں بلوچی ثقافت کے اہم جُز کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں فارسی اور صوفی شاعری کے اثرات بلوچی شاعری پر، اور بلوچی ثقافت سے اظہارِ محبت مخصوص انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس صوفیانہ کلام میں نہ صرف حقیقی محبت کا اظہار ہے بلکہ مجازی محبت کو خوبصورت انداز میں بیا ن کرنے کے ساتھ ساتھ وطن یا مٹی سے محبت سے جوڑ کر مجازی محبت کو نئے انداز میں بیان کیا گیاہے۔ جس میں حُسنِ مجازی کو فطرت کے مختلف نظاروں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ نظارے جو اپنی مٹی کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت اور تہذیب کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ جو غزل کی شکل میں لوگوں کی داستانیں اور پُرانی کہانیاں موجود ہیں۔ اسی بلوچی شاعری کا صفِ اوّل شعراء میں شامل جناب سیّد ظہور ھاشمی اور کریم دشتی صاحب ہیں۔ اور اس مقالہ میں دشتی کی شاعری کو زیادہ مدِنظر رکھا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ : تب، زاہیرنک، غزل، صوفی شاعری، نازینک، داستان، ثقافت، لئیکو

تعارف

دشتی کی شاعری نے خاص طور پر بلوچی ادب میں پائی جانے والی بلوچی شاعری کے دو اوصاف کو وسعت دی ہے جو کہ دو مختلف '' تا، آب'' ہیں۔ انہیں '' ما، رشت'' (احساسات و جذبات) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں ''تا، آب'' غم اور خوشی کے احساسات کو ظاہر کرتی ہیں‌مگر دونوں میں ایک تعلق کا احساس پایا جاتا ہے۔ غم کو ایک منفرد شاعری مصنف '' زاہیرونک'' سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ (زاہیرونک کے معنی ہیں خواہش) زاہیرونک ایک شاعری نظم ہے بلکہ نغمہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، جو ''شا، وانگ'' یعنی چرواہے سے وابستہ ہے۔ چرواہے کا یہ نغمہ ہمیشہ موسیقی آلے ''ڈونالی'' (بلوچی بانسری) کے ساتھ بجایا جاتا ہے۔ یہ شاعرانہ نظم چاہت، خواہش، تنہائی اور موسیقی سے بھر پور ہے اور خود مختار زندگی اور خاص طور پر خطہ زمین کی خوشی مناتی ہے۔ وہ خطہ زمینِ بلوچستان جسے عام طورپر'' نہ معاف کرنے والا'' سمجھا جاتاہے۔ اسے ہمیشہ ایک خاص قسم کی طاقت، ایک محبوب کی

طاقت کی ضرورت رہی ہے جو اس کے ساتھ ''لی،وار'' (گرم ہوا یا صحرا کی ہوا) اور ''ہوشکاواگ'' (خشکی اور قحط سالی) میں بھی ثابت قدم رہ سکے۔

یہی وجہ ہے کہ خطہ زمین اپنے شاعری معنوں میں خلافِ قیاس فیاض مگر سخت سرزمین ہے۔ شاعری کا یہ انداز ایک بلوچ کے صحرائی طرزِ زندگی کے خاص فخر کو ظاہر کرتا ہے۔ اتفاقی طورپر کریم کے نام کا اگلا حصہ بھی اسے ظاہر کرتا ہے۔ ''دشتی'' جس کے معنی ہیں صحرا سے تعلق رکھنے والا۔قدیم بلوچی کا دوسرا ''تا،آب'' یا ''مارشت'' جسے دشتی نے اپنی شاعری کا حصہ بنایاہے اور اپنے کام میں اسے وسعت دی ہے وہ ہے'' ناز، اینک ''(عام معنی ہیں تعریف)۔'' ناز، اینک '' طرب و نشاط کے کئی احساسات کو اجاگر کرتی ہے۔

ایک بلوچی '' ناز، اینک '' شادی کا ایک گیت بھی ہوسکتا ہے جس میں دولہا کو اُس کی ہمت اور بلوچی ثقافت کی پاسداری پر سراہایا جاتا ہے۔ اس قسم کے ''ناز، اینک'' میں بلوچی ''دی، وان'' یا ''مارا گائیں'' (اعلیٰ درجے کا ثقافتی تہوار)کا بھی ذکر کیا جاتاہے۔ اس سرزمین کی قدیم روایات اوربلوچی ثقافت کا اہم رنگ جو اب تک محفوظ ہے۔ ''ناز، اینک'' کی ایک اور قسم ''لوری'' (لی،یلو) ہے۔ بلوچی ناز اینک ان افراد کو سراہنے کے لئے بھی لکھی جاتی ہے جنہوں نے جنگ میں اپنی جانیں قربان کر دیں یا کسی اہم مقصد کے حصول کے لئے کو شاں ہیں۔ تو بلوچی ''نازاینک'' ہو یا ''زاہیرونک'' ایک بلوچ شاعر اس کے ذریعے اپنی سر زمیں سے اور اپنی ثقافت سے روایتی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ بلوچی ادب کی ان دونوں اوصاف کو خواہ وہ غم سے متعلق ہو یا خوشی، وہ اپنی ثقافتی و تہذیبی تفاخر کے اظہار کے لئے استعمال کرتا ہے۔ دشتی کی چاعری میں کوئی بھی شخص ان اوصاف کو جدید زبان میں پڑھ سکتا ہے کیونکہ یہ ترقی یافتہ اور جداگانہ بلوچی غزل کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ (یوسف۔2009)آنے والے پیراگراف میں، ہم کوشش کریں گے کہ دشتی نے جو اپنے کلام میں بلوچی تہذیب و ثقافت اور مانوی رنگ بھرے ہیں انہیں اُجاگر کرتے اور اُن کا جائزہ لیں۔

دشتی کی شاعری:

دشتی کی شاعری کے جائزے سے پہلے ہم ایک واقعہ سے ابتدا کرنا چاہیں گے۔ جو ہمیں دشتی کی اپنی ثقافت اور طرزِ زندگی کے بارے میں رویے کو سمجھنے میں مدد دیگا۔ ایک شخص جو دشتی کو اچھی طرح جانتا تھااور اس کے ساتھ کئی مواقع پر سفر بھی کر چکا تھااُس نے ہمیں بتایا کہ دشتی کے بلوچ خانہ بدوش کی زندگی کے بارے میں کیا خیالات تھے۔ اُس نے بتایا کہ دشتی نے اسے ایک بار مشورہ دیا کہ بلوچستان میں سفر کے دوران اگر تمھیں کہیں رات رکنا ہو یا کھانا کھانا ہو ہمیشہ ایک ایسے بلوچ گھر کا انتخاب کرنا جہاں بلوچ تہذیب و ثقافت کی قدیم روایات موجود ہوں۔ دوسرے الفاظ میں اُس نے بلوچ ''ماراگائیں'' یا روایتی مہمانداری کو ترجیح دی۔ حالانکہ اُس کی شاعری سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دیگر معاملات میں اتنے زیادہ روایت پسند نہیں تھے۔ وہ بلوچستان کی ترقیاتی سیاست کے صفِ اوّل کے دانشور تھے۔ پوسٹ کولو نیل بلوچستان میں 1950ء اور 1960ء کی دہائی میں انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے سے یورپ کی ترقیاتی اور سیکولر سیاست کے بارے میں بیداری پیدا کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ اُن کی کئی تحریروں میں آپ کو پرانے تہذیب و ثقافت کو نئے انداز سے پیش کرنے والا شخص ملے گا۔ جبکہ وہ جدید زندگی کے مادی اور عقلی یا لا مذہبی خیالات کے درمیان فرق واضح کرتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ مذہبی اصولوں کا مذاق بھی اڑاتے نظر آتے ہیں خاص طور پر جب وہ مذہبی روایات کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ ایک اور واقعہ کے مطابق جب وہ تربت میں مختلف افراد کے ایک گروپ کے ساتھ تھے وہ اپنے دوست کی کتابوں کی دکان پر گئے اور اُس سے کہا کہ وہ اور اُن کے دوست چائے پینے آئے ہیں۔ وہ دوست نہ صرف خود مذہبی شخص تھا بلکہ مذہبی کتابیں بھی فروخت کرتا تھا۔ انہوں نے حسن مزاح کو اس طرح اُجاگر کیا مثلاً وہ کہتا ہے کہ نفسانی محبت کا شکار ہونا گناہ ہے

میری خدا سے دعا ہے کہ یہ مولانا اس کا مزہ کبھی نہ چکھے (234)2

کہا جاتا ہے کہ والٹیئر جب بسترِ مرگ پر تھا تو اُسے ایک پادری نے نصیحت کی کہ وہ اپنی روح کو اب تو شیطان کے چنگل سے بچا لو تو اُس کا جواب والٹیئر نے یوں دیا کہ اب یہ وقت مزید دشمن بنانے کا نہیں۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں دشتی نے بلوچی ادب میں ایک والٹیئر ن شخصیت کے طور پر خود کو ظاہر کیا۔ جب وہ علیل ہو گئے اور جان گئے کہ قریب المرگ ہیں تب بھی وہ ایمان کی طرف نہ پلٹے اور ثقافت کی جانب ہی اُن کا رُجحان رہا۔ یہ بات کافی خلافِ قیاس ہے اور اپنی جگہ ایک سوال ہے کہ وہ کس طرح بلوچ سر زمین کی قدیم دیہی ثقافت اور جدیدیت دونوں سے بیک وقت متاثر رہے۔

ان کی غیر مذہبیت اور جدیدیت سے قطعی نظر انکی شاعری میں زمین اور ثقافت سے رومانوی تعلق نظر آتا ہے۔ بہت سے جدید ادبی اصول دان اور عالموں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اٹھارویں صدی کے یورپی انقلاب کے بعد اور بعد میں بورگیوس کے یورپ میں انقلاب کے بعد، طبقہ اشرافیہ اور ایلیٹ کلاس کا کلچر تبدیل ہوگیا۔ خداداد ایمان اور اختیارات نے اس کی جگہ لے لی اور نتیجتاً جدید قومی ریاستوں نے ثقافت کے جمالیاتی تناظر اور خیالات کو بلند کیا اور اسے بطور قومی فخر اور قومی اتحاد کے پیش کیا۔ (Eagleton, 2014) تیسری دنیا کے ممالک بیسویں صدی میں آزادی کی بہت سی تحاریک نے ان خیالات کو استعمال کیا اور اپنے قومی ثقافتی نظریات کو پروان چڑھایا۔ دشتی دانشوروں کی اس جماعت میں سے تھے جنہوں نے قومی آرزوں کو قومی ثقافتی تناظر میں پیش کرنے اور سیاسی اور ثقافتی آزادی حاصل کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ کئی شعراء نے قدیم دلیرانہ نغمے لکھنے اور روایتی داستان طرز کی شاعری کی مدد سے بلوچ ماضی اور بہادرانہ جنگوں کو اجاگر کیا۔ دیگر شعراء جیسے عطا شاد اور ہاشمی کے برعکس دشتی کو جداگانہ صلاحیت حاصل ہے۔ جس سے انہوں نے بلوچی ادب کی قدیم شکل کو جدیدیت بخشی اور ایسا کرتے ہوئے انہوں نے ترقی کرتی انتہائی قومی آرزوں کو مدِ نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ صدیوں پرانی قدیم بلوچی شاعری جدید شکل اختیار کر چکی ہے۔ بیسویں صدی کے وسط میں طرز اور انداز کی اس تبدیلی کو کوئی بھی محسوس کر سکتا ہے۔ (بادل خان، 2003ء)

باوجود یکہ دشتی نے مذہبی رسومو قواعد کی خلاف ورزی کی ہے اپنی بنیادی روایات سے محبت انہیں ایک رومانوی شخصیت کے طور پر پیش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بلوچ سر زمین اور خانہ بدوشی کی طرزِ زندگی کے رومانوی شاعر بھی ہیں اور یورپی بیداری کے خیالات کے حامی بھی ہیں۔ درج ذیل نظم میں بلوچی زاہیرونک اور نازاینک دونوں کے نہ صرف رنگ نمایاں ہیں بلکہ قدیم دیہی بنیادوں سے محبت کا جدید خیال بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔

دلوں میں بولان کے لئے دکھتا ہے[۳]
جب بولان شجر بہار بن جاتا ہے
اے دل! ایک محبوب کی اپنے محبوب سے محبت کی طرح
بولان خوبصورت شاعری کی طرح ہوجاتا ہے۔
ایک ماں کے اپنے بچوں کے لئے قلبی کیفیت کی طرح
بولان کے بغیر بلوچستان نہیں

اک چاہت بھرے دل کے بغیر بولان نہیں رہے گا
میں تمھارے اسرار کسی کو نہیں بتاؤں گا
سوائے اُن کے جو تمھیں دل سے جانتے ہیں
اے کریم دشتی جیسے کہ میں تمھیں بتا چکا ہوں
بولان کے دن ہمیشہ اُداس رہیں گے (226)

اندازِ بیان خوشی سے غم کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ فارسی غزل کی طرز میں لکھی گئی یہ نظم بلوچی ثقافت کی تمام خصوصیات سے مزّین ہے جیسے کہ ایک پہاڑ، چشمہ اور وادی کا جشن، جو علامت ہے مضبوط ارادے، عظمت اور آزادی کی۔ وسیع اور بنجر پہاڑ آزادی اور سختی کادوہرا اثر لئے ہوئے ہیں جو نہ صرف شاعر بلکہ بلوچی ثقافتی بنیادوں کا بھی حصہ ہیں۔دشتی صحرائی زندگی کی آزادی کی قیمت جانتے ہیں، اس آزادی کی قیمت سختی اور تنہائی

ہے جوکہ اس نظم میں مختلف انداز میں ظاہر کی گئی ہے۔ نفسانی محبت کو شاعری کے حوالے سے ظاہر کرنا فارسی غزل کی خصوصیت ہے جسے دشتی نے نئے مستقبل کی اُمید اور آرزو کے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے۔ دشتی اپنے ناہموار اور جداگانہ مسکن کو ایک مختلف سیاسی مگر رومانوی معنی دیتے ہیں۔ بورگیوس کی ریاستی قومیت کے نظریے کے حوالے سے بولان کو جداگانہ قومی اہمیت حاصل ہے۔ دیہی احساس و شعور میں یہ چاہت اور قومیت سے متعلق نیا وسیع المنظر احساس ہے۔ بلوچی شاعری میں عظیم احساس سے عاری ہے۔ یہ عام بلوچ کے خانہ بدوشی کی طرزِ زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔مقامی پسِ منظر اور جغرافیائی غیر یقینی طریقے میں۔ مقامی اور قبائلی شخصیات سے کوئی بھی بلوچوں کے بارے میں قیاس آرائی کر سکتا ہے مگر ملک یا ریاست کا نظریہ اپنے جدید معنوں میں بلوچ احساس و شعور کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ مثلاً ملک یا ریاست کا لفظ (دیہہ یا ملک)مقامی معنی رکھتا ہے۔ برعکس اس کے کہ یہ لفظ انڈیا یا امریکہ کے لئے بولا جائے۔ دشتی اور کئی ہم عصر دیگر شعراء نے بلوچ ثقافت میں نئے احساس کا اضافہ کیاجس کی وہ ہمیشہ سے مزاحمت کرتا رہا ہے اور دشتی اس سے واقف بھی تھے جس کا رونا وہ بولان کی مایوسی کی صورت میں روتے ہیں۔ عطا شاد ۔۔۔۔بلوچی شاعری کے سب سے نمایاں شاعر ہیں جو اس سے ملتی جلتی روحانی اذیت کا اظہار کرتے ہیں۔ شاید عام پریشانی کے جذبات کو کمالِ فن سے قوم کی دم توڑتی اُمید کی صورت میں سوال کرتے ہیں۔

یہاں یخ بستہ سردی میں، میری سرزمین کی اذیت کی کوئی انتہا نہیں
اس تاریکی میں، میں نے تمھارے جسم کی گرمائش کو کہاں نہیں ڈھونڈا ؟

یہاں ایک مضبوط تعلق، ایک محسوس کئے جانے والے تعلق کی کمی ہے۔ دیہہ (زمین) ایک بعید اور گمراہ کُن خیال بن چکا ہے۔ پُر جوش سردی اور گرم مجوشی کی کمی میں موجود ربط شاد کا استعادہ ہے۔ شادِ باطل استدلال سے کام لینے میں ہُنر مند ہیں اور ایک عظیم شاعر ہیں مگر وہ دشتی کی طرح دیہی ثقافت کے اتنے قریب نہیں ہیں۔ شاد کی غزل میں بلوچی ثقافت کے کئی رنگ موجود ہیں۔ وہ بنجر صحرا کی اذیتوں اور مزاج کو تو بیان کرتے ہیں مگر

اس میں بنیادی سادگی کی کمی ہے۔ اس میں ''لائی، کوٗ'' (ایک مختلف انداز کی زاہیرونک) کی کمی ہے جو اُس کھردری ناہموار زمین کی روح ہے۔ اگر آپ ''ڈو، ماگ'' (ایک چھوٹی پہاڑی چوٹی) پر آئیں اوردور وادی پر ایک نظر ڈالیں تو جو پہلی چیز ذہن میں آتی ہے وہ ہے تکلیف دہ فاصلہ اور ساتھ ہی وسیع النظر کی خوشی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ دشتی شاعری بلوچی ثقافت مقامی شناخت کی روح سے بہت قریب ہے۔ یہ آرزو مند ہے مگر اُس کا انداز تلخ ہے۔جیسا کہ اس ''لائی، کوٗ'' پر مشتمل بلوچی غزل میں کہا جاتا ہے:

نسیمِ بہار نے مجھ میں جان ڈال دی ہے
ہلکی ہوا کچھ یادیں لے آئی ہے

میرا پُر شوق دل ایک جام شراب کی طرح ہے اور اس میں تمام درد موجود ہیں
تمھارے رنج وغم سے مجھے اذیت ہوگی
(تاکہ تم غم سے آزاد ہو جاؤ)
پھول مجھے تمھارا ساتھ یاد دلاتے ہیں
گنگناتی فاختہ (شاشل) کے نغمے تمھارے خبر لاتے ہیں
میری محبت اور چاہت کے مرکز
آؤ میرے گھر آؤ جو تمھاری چاہت سے مزّین ہے
وقت اپنی رفتار سے گزر رہا ہے
وعدہ شکنی کا یہ لمحہ باقی رہے گا
بہار کی آمد کا وقت آچکا ہے
مجھے دوستی کے قیام کی خواہش ہے
میں ارد گرد دیکھ رہا ہوں
وہ راستہ جو میں طے کر چکا ہوں
واہ ! ان شاندار لمحات کے لئے
جب چاند میرے محبوب کا دیدار کر کے میرے پاس آئے گا (227)

درد، اذیت، فاصلہ اور چاہت زاہیرونک کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ دشتی البتہ ''شا، وانگ'' کا نغمہ گانے کے لئے ایک منفرد بلوچی غزل کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

اس '' زاہیرونک'' یا '' تاآب'' اور روایتی بلوچی شعر (ایک ہی طرز میں کہی جانے والی طویل نظم) میں مزاج اور انداز کا فرق بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل شعر میں جسے اٹھارویں صدی کے مشہور بلوچی شاعر '' مُلا قاسم'' نے لکھاہے۔ وہی روایتی طرز اختیار کیا جو دشتی بلوچی شعر لکھنے میں استعمال کرتے ہیں۔

اے گنگناتی فاختہ آؤ اور یہاں اپنی خوبصورت آواز کے ساتھ آ بیٹھو
تم ایک حَسین پرندہ ہو جس کی زبان طوطے کے جیسی ہے
تم میری قاصد بن جاؤ اور میری خواہشات کو دور کسی تک پہنچادو

قاسم کی شاتل (گنگناتی فاختہ) سے اس درد بھری درخواست میں ایک خود پسند محبوب کی خواہشات کی صدائیں اور رنگینی موجود ہے۔ یہ محبوب دُور اور اکیلا ہے مگر یہ کبھی بھی پریشان نہیں ہوتا۔اس میں پہاڑوں میں پائے جانے والے شخص کی طرح فخرو غرور شامل ہے۔ ''شعر''رزمیہ نظم میں بیان کی جانے والی بہادرانہ خصوصیات بیان کی جاتی ہیں، اس کی درجنوں رُباعیاں یا قطعات یکساں خط اور لمبائی میں چلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ ہمیشہ پڑھنے والے کو سادہ اور ایک ہی طرز میں لکھی جانے والی اور بورمحسوس ہوتی ہیں کیونکہ یہ ہمیشہ جذباتی گلوکاروں کے لئے ترتیب دی جاتی ہیں۔ یہ روایتی گلو کا رجنہیں '' پا، لاوان'' کہا جاتا ہے۔ اس سادہ طرز کے شعر کو اپنے دِنگل کی جداگانہ آواز کی مدد سے جاندار بنادیتے ہیں۔ شعر میں روایتی غزل کی تیزی ،روانی اور طرز کی کمی ہوتی ہے۔جبکہ بلوچی شاعری کے شعر کی دونوں جدید و قدیم حالتوں میں نظریہء محبت اپنی یکساں خصوصیات، تفاخر، پاکیزگی اور ایک منفرد رومان، جس کا موازنہ کسی قرونِ وسطی کے شائستہ رومان و محبت کیا جا سکتا ہے، کے ساتھ اُبھرتا ہے۔ انگریز ترجمان اور بلوچی شاعری کے تبصرہ نگار ایم۔ لونگ ورتھ ڈیمز بلوچی رومان کے بارے میں کہتے ہیں کہ مشرقی نسل میں سے

دشتی کی شاعری ماضی کی یاد دلاتی ہے۔ جس میں چرواہے کی زندگی کی پُر خلوص

چاہت شامل ہے اور منڈلاتی جدیدیت کی پریشانی شامل ہے۔

ماضی اور مستقبل پر رکھی گئی اس نگاہ کو نہ صرف اُنہوں نے اپنی شاعری میں الفاظ کی صورت میں سمویا ہے بلکہ اسی سے اُنہوں نے اپنی شاعری کی بناوٹ کی ہے۔ زاہیرونک کی مستقل مزاجی کو اپنی شاعری میں قلمبند کرتے ہوئے وہ بلوچ ثقافت کی طویل مزاحمت کو باہر کی دنیا سے بغل گیر کرتے نظر آتے ہیں۔وہ اپنی وسیع النظری اور جدید تکنیک سے باخبر نظر آتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بلوچی طرزِ شاعری نے اُردو اور فارسی غزل اور لسانی تغیّر کی صدیوں تک مزاحمت کی ہے جیسے کہ وہ نئے دن کے اُجالے میں اپنے غیر یقینی مستقبل کے بارے میں فرماتے ہیں۔

تُم میرے اعصابِ شکن دُکھوں کی اندھیری رات ٹھہراتے ہو
دن کا اُجالا اجنبی دُنیا کی بے چینی لائے گا
دن کا اُجالا میرے محبوب کی تکلیف دینے والی یادوں کو دُور لے جائے گا
تُم میرے اعصابِ شکن دُکھوں کی اندھیری رات ٹھہراتے ہو
شام کا دُھند لگا ایسے ہے جیسے میرے محبوب نے زُلفیں بکھیریں ہوں
بالوں کے درمیان مانگ کسی کہکشاں کی مانند ہے
اُس کے بالوں سجا پھول جیسے چمکتا ستارہ ہو
اُس کا چہرہ صبح کے ستارے کی مانند ہے۔ (119)

مزید یہ کہ :اپنی ماضی کی زندہ یادوں میں (تا، رنگ) میں مستقبل کے حَسیں بادلوں کو خوش آمدید کہتا ہوں (وا، ہاگ)

میں اپنی غموں کو پی سکوں اور اُن کو بُھول جاؤں۔ اگر میرا دوست (بمعنی محبوب) پہلا قدم بڑھا کر مجھ تک آئے
میں بلوچ استحقام کی مضبوط دیوار کو توڑ دوں گا (232)

پہلی نظم میں آئندہ زمانے کے بارے میں تشویش پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس میں ترقی اور نئے اُجالے کی اُمید پائی جاتی ہے۔ تاہم ایک اجنبی دُنیا میں آنکھ کھولنے کا تصوّر

پریشان کُن ہے۔ دوسری نظم میں بھی مزاحمت، رواجوں اور غیر یقینی اُمید کی تکرار ہے۔ چرواہے کی زندگی کی تاریک رات کو رنگوں سے مزّین کرتے ہوئے دشتی خوف اور طنز کے ملے جلے احساسات کے ساتھ ترقی اور تبدیلی جیسے سوالات کا سامنا کرتے ہیں۔ دوسری نظم میں وہ اپنی ذات سے بحث کرتے ہیں۔ ماضی اور مستقبل پر باربار نگاہ ڈالنے کی دشتی کی صلاحیت یہاں ایک فیصلہ کُن صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس خاموش تقابلی مسئلے کا حل وہ مشہور مصنف ''لائی کو'' کے ذریعے نکالتے ہیں اور جس کا اظہار اُن کی پوری شاعری میں دو قدیم زبانوں '' وا، ہاگ '' اور '' تا، رنگ '' کی صورت میں کیا گیا ہے۔ یہ دونوں اظہار یئے '' زاہیرونک ''اور '' قدیم بلوچی شاعری '' کا خلاصہ کرتے ہیں۔ '' وا، ہاگ '' مستقبل کی خواہش کو ظاہر کرتی ہے جو کہ غیر یقینی اور غیر حقیقی ہے ۔یہ چونکہ اصل خواہشات اور منصوبہ بندی پر مشتمل ہے۔ اس لئے یہ غم سے بھرا ہوا ہے۔ '' تا، رنگ '' بھی ماضی کی اُداس یادوں سے بھرا پڑا ہے۔ یاد اچھی یا بُری ہو سکتی ہے مگر '' تا، رنگ '' میں کہی جانے والی شاعری کا مزاج اُداس کُن ہوتا ہے۔ دشتی اُن اظہاریوں کو مستقبل کی پریشانی کو پیش کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جو کہ اُن چہرے پر عیاں ہے اور مشکل ہے کہ وہ ماضی کی یاد کو دبا سکے۔

محبت میں اپنائی گئی ادھوری چاہتوں اور خواہشات کی کوئی حد نہیں
تمھارا بے نُور اور غیر آراستہ چہرہ، میرے نام سے مُنسلک ہونے کی وجہ سے ہے
میں نے جنت کے باغ کو ترک کیا اور دُنیا کی خواہش کو پانا چاہا
دیکھو میری قسمت، زندگی گُزر گئی مگر محرومی کا کوئی خاتمہ نہیں
وہ جنہوں نے مدینہ کا سفر کیا اور حُوروں کو بطور انعام پالیا
یہ میری قسمت کہ میں اپنی وفاداری کو '' ڈو، کرم '' کے میٹھے پانی کے لئے بھی نہ توڑ سکا
مگر کریم کی حُرمت و تعظیم کو دیکھو کہ وہ مر چُکا ہے مگر ابھی بھی ثابت قدم ہے
اس کا سر گرد آلُود ہے مگر اب بھی خود کو مُقدر کا سکندر سمجھ رہا ہے۔

یہ خوبصورت نظم دشتی کی تخلیق کا حَسین شاہکار ہے۔ دشتی کے کیچی زُبان میں الفاظ کے برمحل استعمال اور اُن کے اظہار کی بلندی کو اپنے ترجمہ کی کمزور زبان کے احاطہ تحریر میں لانا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ اُنہوں نے اُردو اور فارسی غزل سے محبوب کے طرزِ تحریر کو بلوچی طنزیہ انداز میں رہتے ہوئے اختیارکیا ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں مُتنبہ بھی کرتے ہیں‌اور لُطف اندوز بھی ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس طنزیہ ا نداز اور غزل کے طرزِ تحریر سے جس سے اُنہیں ثقافتی سیاق و سباق کے ساتھ اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ دشتی کے فارسی انداز کے استعمال کی نُمایاں کامیابی یہ ہے کہ وہ نہ صرف بلوچ زاہیرونک کے انداز اور روایتی ''ناز، اینک'' کے سیاق و سباق کو متعارف کراتے ہیں بلکہ ایک ثقافتی اورسیاسی تنقید / نقاد کو بھی شامل کرتے ہیں‌جو دیگر کئی کی طرح جاری رہتی ہے۔ اسے ارتقاعی/ ترقیاتی اس وجہ سے کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ نہ صرف تہذیب کا جشن مناتی ہے، جو کہ پسماندہ بلوچی شاعری کا ایک غالب انداز ہے بلکہ وہ تہذیب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں‌مگر ساتھ ہی ساتھ اس میں خوف و پریشانی کا عنصر بھی شامل ہے۔ اس سطح کا شاعری شعور بلوچی حتیٰ کہ اُردو شاعری میں بھی بہت نایاب ہے۔

نتیجہ

اس مقالہ میں دشتی کی شاعری کے تنقیدی جائزے کے دوران کوشش کی ہے کہ میں جدید بلوچی شاعری کو ثقافتی تناظر میں متعارف کرائیں اور اس ضمن میں اس نے جو حالیہ ترقی کی ہے اُس کو سمجھا جائے۔ دشتی اُن دانشوروں اور ادبی مصنفین کے گروہ کے اوّلین رُکن ہیں‌جو کہ پسماندہ سیاسی اور ثقافتی تناظر میں جدید بلوچی کے بارے میں بیداری کے ذمہ دار ہیں۔ اس گروہ میں گل خان نصیر، سیّد ظہور شاہ ہاشمی، عطاشاداور دوسرے کئی افراد شامل ہیں‌جنہوں نے بلوچی ادب کی شاعری شعور کو تبدیل کرکے اُس کو اُبھارا۔ دشتی کا اس ضمن میں کیا گیا کام ادبی اور ثقافتی طور پر اتنا وسیع ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اسے ایک مضمون میں قلمبند کرنا نا ممکن ہے۔جیسا کہ اگر ہم پیچھے مُڑ کر بلوچ ادب کے اِس دور پر

نظر ڈالیں‌تو نُمایاں نظر آنے والی چیز ہے۔ غزل کی ترقی اور مُنفرد بلوچی انداز دشتی کی ثقافت کی گہری سمجھ بوجھ اور بلوچ معاشرے کے احساسات کے مشاہدات نے اُس کی آواز کو ایک جداگانہ طاقت بخشی ہے۔ جسے اُنہوں نے وسیع اور معنی خیز انداز میں ثقافتی تبدیلی کو پیش کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بدل خان صابر(Badal Khan Sabir)، '' *Balochi Folk Literature* ''
South Asian Folklore : An Encyclopedia Afghanistan, Bengladesh, India ،
(لندن : روٹلج، ۲۰۰۳ء) ص ۴۲۔

۲۔ ایم لانگورد ڈیمز (M. Longwirth Dames)، *Balochi Folklore* ، Folklore Journal،
جلد ۳، اپریل ۱۹۰۲ء، ص ۲۵۲۔

۳۔ کریم دشتی، کتاب '' *دل زری بولان* '' (کوئٹہ بلوچی اکیڈمی پریس ۲۰۰۹ء) ۔

۴۔ ٹیری ایگلٹن (Terry Eagleton)، *Culture And Death of God* (نیو ٹاؤن، یالے یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۴ء) ص ۱۲۵۔

۵۔ عطاء شاد، کتاب، '' روچ گر'' (کوئٹہ بلوچی اکیڈمی پریس ۱۹۹۵ء)۔

۶۔ شیر محمد مَری، کتاب '' *بلوچی زبان و ادب کی تاریخ* '' (کوئٹہ بلوچی اکیڈمی پریس، ۱۹۷۳ء)۔

۷۔ بو اوتاس (Bo Utas) *"Genres In Persian Literature"* (مرتب) گونیلا لنڈ برگ واڈا
(Gunilla Lindbarg Wada) *Literary History Towards a Global Prospective*
(برلن : ڈی گرویٹر ۲۰۰۶ء) ص ۱۹۱۔

۸۔ ولی محمد رکشانی، کتاب '' *بلوچی دوددربیدگ و سچلاوانی آداب* '' (بہرین : بلوچی ادبی جہد کار، ۲۰۱۵ء)۔

۹۔ ظہور شاہ ہاشمی، کتاب '' *بلوچی زبان و ادب کی تاریخ* '' (کراچی : سیّد ہاشمی اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)۔

۱۰۔ گل خان نصیر، کتاب '' *تیر گال کارت* '' (کوئٹہ : بلوچی اکیڈمی پریس، ۲۰۱۴ء)۔

۱۱۔ کرینہ جہانی (Carina Jahani)، *Bya o Baloch-the Cry Of a Baloch Nationalist*،
Orientalia Succana، جلد ۴۳، شمارہ ۱، جون ۱۹۹۷ء)، ص ۸۱۔

۱۲۔ محمد سردار خان بلوچ (Muhammad Sardar Khan Baloch) ، *A Literary History Of Balochi* (کوئٹہ : بلوچی اکیڈمی پریس، ۱۹۸۴ء)۔

۱۳۔ پناہ بلوچ، کتاب'' بلوچی ادب: ایک تاریخ، ایک تسلسل '' (کوئٹہ: بلوچی اکیڈمی پریس، ۲۰۱۶ء)۔
۱۴۔ قادر مجید، کتاب'' جاچ گنج '' (کراچی : سیّد ہاشمی رفرنس لائبری، ۲۰۱۳ء)۔
۱۵۔ شے رگام، کتاب'' بل، گوشتن و گالوار'' (کوئٹہ : بلوچی اکیڈمی پریس، ۲۰۱۲ء)۔
۱۶۔ شے رگام، کتاب'' بادشاہ ھداوندوت ات : بلوچی کساھانی دفتر'' (کوئٹہ: بلوچی اکیڈمی پریس)
۱۷۔ شیر محمد مَری، ''بلوچی کہنیں شاعری '' (کوئٹہ : بلوچی اکیڈمی پریس، ۱۹۷۰ء)۔
۱۸۔ آرتر جا ن آربیری (Arthur John Arberry) ، *The Legacy Of Percia*
(آکسفورڈ : کلیر نڈن پریس ۱۹۸۶ء) ۔
۱۹۔ احسن یار شاتر (Ehsan Yar-Shater) *Percian Poetry In The Timurid And Safavid*
Penods , (کیمبرج : کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۶ء)۔
۲۰۔ قنو چھراریا نپور (Manoothehr Aryanpar) *A History of Percian Literature ,*
(شہران:کاپھان پریس، ۱۹۷۳ء)۔
۲۱۔ انڈلیس ویڈمارک (Anders Widmark) Voices Of The Borders, Prose On The ,
Margins, Exploring The Contemproray Pashto Short Story In a Context Of
War And Crisis, (اسپلا : اکٹا یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۱ء)۔
۲۲۔ گل خان نصیر، کتاب'' داستانِ دوتیین و شیرین '' (کوئٹہ : بلوچی پبلکیشن، ۱۹۶۹ء)۔
۲۳۔ گل خان نصیر، کتاب ''گلِ بانگ '' (کوئٹہ : بلوچی زبانی دیوان، ۱۹۵۱ء)۔
۲۴۔ کرینہ جہانی (Carina Jahani) *"The Formal Structure of Gul Khan Nasir*
Poetry" ، Orientalia Succana، جلد ۴۳، شمارہ ۶ دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۴۱۔
۲۵۔ کرینہ جہانی (Carina Jahani) *"Is There An Urban Mind In Balochi*
The *Literature"* Urban Mind Cultural And Environmental Dynamics
(اسپالا :اسپالا یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۰ء)،ص ۴۵۷۔